مولانا رومی سے علامہ اقبال کے چند استفسارات

خالد محمود سنجرانی

ABSTRACT:

Allama Iqbal's Urdu poem "Peer o Mureed" reflects the imaginative dialogue between Maulana Rumi and Allama Iqbal in which Allama Iqbal seek guidance from Rumi on various subjects of his times. Allma Iqbal concidered Rumi as his "Murshid" specially in his persian poetry. This paper deals with an Urdu poem in which Allama Iqbal raised some important questions related with the contemporary situation of the Muslims .

''پیر رومی'' سے ''مرید ہندی'' کا پہلا استفسار 'علم حاضر' سے متعلق ہے۔

مریدِ ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جُوئے خوں علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

پیرِ رُومی

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود [۱]

اگرچہ مولانا رومی اور علامہ اقبال کے درمیان صدیوں کا فاصلہ موجود ہے لیکن علامہ اقبال کو کم و بیش اسی صورتِ حال کا سامنا رہا کہ جس سے مولانا رومی اپنے عہد میں کر چکے تھے اور جس کی رو سے جاں پر بدن مقدم قرار پایا، علم کو عقل اور استدلال سے وابستہ کیا گیا اور مظاہر کو عقلیت کے زاویوں سے پرکھنے کا رواج عام ہوا تھا۔ علم کے بارے میں مولانا رومی سے علامہ اقبال کا استفسار اس لیے بھی معنی خیز ہے کہ علامہ اقبال سے قبل سرزمینِ ہند میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہر شعبہء حیات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی کی جس نے مشرق کے انداز و اطوار بدل کر رکھ دیئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں سرزمینِ ہند پر انگریزوں کی مکمل اجارہ داری کے بعد علوم کا بنیادی ڈھانچہ

یکسر تبدیل ہوا۔ نصابات بدلے گئے، تعلیمی اداروں کی ماہیت مکمل طور پر تبدیل ہوئی، علمی دنیا میں عقل و استدلال کو فوقیت دی جانے لگی۔ حتیٰ کہ قرآن حکیم کی تفاسیر کو عقل کی بنیادوں پر لکھا اور پیش کیا گیا۔

علامہ اقبال سے قبل علی گڑھ تحریک کا غوغا بلند ہوا اور عقلی و استدلالی سطح پر اس تحریک نے مسلمانان ہند کو ایک نئے شعور سے ہمکنار کر دیا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے علم کے حصول کو ملازمتوں، جاہ و منصب تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ بنا کر پیش کیا، روح پر بدن کو فوقیت حاصل ہوئی۔ سرسید کے عہد میں اگرچہ اکبرالہ آبادی نے مسلمانوں کو اس خطرے سے خبردار کیا لیکن ان کی آواز میں اتنی توانائی کہاں تھی کہ 'علم را برتن زنی' سے روک کر نو آبادیاتی نظام میں علوم کے نئے تشخص کو تبدیل کر پاتی۔

علامہ اقبال سے قبل ہی علوم میں حد درجہ بڑھے ہوئی عقلیت پسندی کا خوف ناک انجام یہ ہوا کہ دین کی تعبیر کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا گیا۔ علامہ اقبال جدید علوم کی اس غایت کا شخصی تجربہ رکھتے تھے، ان کے پیش رو جس معاشرت کو چھوڑ کر گئے تھے، علامہ اقبال اس سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ اس تجربے نے ان کی روح میں کرب کو ابھارا جس کرب کا اظہار ان کی شاعری میں بکھرا پڑا ہے:

جب سے پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا ، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی ، طائر دیں کر گیا پرواز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز ۲

علامہ اقبال نے اس پرآشوب فضا سے نکلنے کے لیے مولانا رومی کے افکار سے فیض پایا۔ اقبال کے اردو کلام میں علوم کی ساخت اور اس کے تشخص کی منبع و مرکز مولانا رومی ہیں۔ علامہ اقبال بڑی دردمندی اور آس کے ساتھ ان سے استفسار کرتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں علم کے ہاتھوں دین زار و زبوں ہیں۔

یوں تو علامہ اقبال نے اپنی اس اردو نظم ''پیر و مرید'' میں کئی سوالات کا جواب مولانا رومی کے اشعار کی مدد سے فراہم کیا ہے لیکن اب بھی علامہ اقبال کا یہ استفسار اور مولانا رومی کا جواب ہماری دنیا کے لیے مینارہ ءنور ہے کہ ہم علم کو دل سے، روح سے ہم آہنگ کر لیں تو علم ہمارا دوست بن جائے گا۔

موجودہ عہد میں علوم کی حیران کن پیش رفت اور ترقی نے چشم آدم کو حیران ضرور کر رکھا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ علوم کی یہ ترقی ہمارے جسموں سے جڑ گئی ہے، روح سے نہیں۔ آج ہم سب انفارمیشن کے عہد میں زندہ ہیں اور کسی سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ علوم کے اس ترقی نے دکھی انسانیت کے لیے وہ کچھ نہیں کیا

جس کی آس تھی۔ آج علوم کے مراکز نے تجارتی کمپنیوں کو زیادہ فائدے دیئے ہیں، اسلحہ کے انبار لگا کر رکھ دیئے ہیں، علوم کی اس ترقی نے چند خاندانوں کو ثروت مند بنا دیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علم کی اس بڑھوتی کا فائدہ انسانیت کی بجائے فردِ واحد کو زیادہ ہوا ہے۔ آج دنیا جس ڈھب پر تشکیل دی جارہی ہے، اس میں روح کے کرب کے ساتھ ساتھ جسم کی تکلیف بھی شامل ہے۔ اس وقت دنیا ایک پکے ہوئے پھوڑے مانند درد سے معمور ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں کہ دنیا کے کس کس خطے میں انسانیت کس طور سانس محض لینے کے لیے بھی تگ و دو میں مصروف ہے۔علم کو روح کے اس کرب کا علاج کرنا تھا، وہ نہیں ہو سکا،علم کو زخمی انسانیت کے زخم صاف کرنے تھے،نہیں کر سکا۔ اسلم انصاری کے بقول جن بچوں کی عمریں تارے، تتلیاں، پھول اورغباروں کے ساتھ کھیلنے کی تھیں اورخواب جتنے بھی سہانے ہیں وہ سبھی سوچنے کی تھیں، اگر وہ بچیاں سوچتی ہیں تو بارود کی بو سوچتی ہیں اور اپنے زخموں کے لیے تارِرفو سوچتی ہیں۔ دنیا کو اس وقت بھی مولانا رومی کے افکار کی ضرورت گزرے ہوئے کل سے کہیں زیادہ آج ہے۔ دنیا کو مولانا رومی کے حسنِ حقیقی کی سمت لوٹنا ہوگا۔ ان کے الفاظ کی سمت کہ جن سے اقبال نے روشنی پائی

علم را بر دل زنی یارے بود

اقبال کے ہاں علوم کی ساخت اور اس کے تشخص کا منبع و مرکز مولانا رومی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال مولانا رومی کی چوکھٹ کو آس مندی کے ساتھ دیکھتے ہیں جس کی رو سے علم کو اگر جسم سے وابستہ کرو گے تو یہ سانپ بن کر تمھارے جسم سے لپٹ جائے گا اور اگر اسے روح سے ہم آہنگ کرو گے تو یہ تمھارا دوست وغم خوار بن جائے گا۔ علامہ اقبال کو علوم کی ساخت کے حوالے ایک بڑا چیلنج درپیش تھا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ عقل وعشق کے نازک رشتے پر غور کرتے ہوئے گزری اور اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے انھوں نے ایک ایسی ہستی سے رجوع کیا جو اپنے عہد میں علوم کے استدلالی حیثیت میں شہیر کا درجہ رکھتی تھی بل کہ اس کوہِ گراں کو توڑ کر روح سے ہم آہنگ ہوگئی تھی ۔مولانا رومی کے افکار کی بدولت علامہ اقبال نے اپنے عہد میں علوم کے اس سیلاب کو روکا جو روحِ جاں کی بنیادوں کو اپنے تیز بہاؤ کے سبب کاٹ رہا تھا۔اس امر میں بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ صوفیا بالخصوص صوفی شعرا کا ایک بڑا طبقہ علوم کی اس غایتِ معنوی کی طرف اشارہ کرتا رہا کہ جس کی سمت نمائی مولانا رومی نے وضاحت کے ساتھ کر دی تھی۔ ہمارے ہاں بابا بلھے شاہ ایسے نہیں کہہ گئے کہ علموں بس کریں او یار۔شاہ حسین ہوں، میاں محمد بخش ہوں، وارث شاہ ہوں، سلطان باہو ہوں یا خواجہ فرید۔۔۔سب کے ہاں ایک ہی رمز ہے کہ بس وے ملاں اکو الف کافی تے ب دی رمز نہ کائی۔صوفی کی ہمیشہ سے زاہد کے ساتھ نوک جھونک رہی ہے کہ وہ مظاہر پر مرتا ہے جبکہ اصل حیات مظاہر سے پرے کسی نہاں خانے میں دھڑک رہی ہوتی ہے۔اس طور دیکھا جائے تو مولانا رومی سرزمینِ ہند کا ایک ایسا روشن استعارہ ہیں کہ جنھوں نے علوم کی سبقت اور مکمل سپردگی کے عہد میں علوم کو روح سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت کا اجاگر کیا۔ بلا شبہ مولانا رومی کا ہمارے زمین پر یہ ایک بڑا احسان ہے۔

علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھی گئی اس نظم[۳۲] کے پہلے ورق کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نظم کا

آغاز ذیل میں درج بند سے کرنا چاہا تھا لیکن بعد میں اس بند سے قبل دو اشعار شامل کیے جو اسی ورق پر ایک کونے میں درج ہیں اور تیر کا نشان مزید وضاحت کر دیتا ہے۔

'مریدِ ہندی

اے امامِ عاشقانِ درد مند! یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند

' خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست'

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا دوست کیا ہے ، دوست کی آواز کیا

آہ، یورپ بافروغ و تاب ناک
نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیر رومی

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست
طعمۂ ہر مُرغکے انجیر نیست ۴

اس بند میں علامہ اقبال نے مولانا رومی کے سامنے اپنے عہد کا ایک اہم المیہ سامنے رکھا ہے جو مظاہر کے منقطع رشتوں سے جڑا ہوا ہے۔علامہ اقبال نے اس باب میں مولانا رومی کے ایک معروف شعر کو درج کیا ۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کا اشارہ موسیقی کے اس آلے کی طرف ہے کہ جو پرانے وقتوں میں کدو کا گودا (مغز) نکال کر تیار کیا جاتا تھا ۔کدو سے اس خول کے ساتھ تار باندھے جاتے تھے ۔اس خشک مغز، خشک تار اور خشک پوست سے موسیقی جنم لیتی تھی ۔ بہ ظاہر اس خشک تار سے برآمد ہونے والی آواز کو مولانا رومی سے حقیقی رشتے اور تعلق سے وابستہ کیا ۔اس طور مولانا رومی کے ہاں مظاہر اور اشیا کا تعلق روحانی سطح پر کسی اوجھل جہاں کا استعارہ بنا ۔مولانا رومی کے ساتھ ساتھ کم وبیش ہر صوفی شاعر نے اپنے اردگرد کے مظاہر کو اس باطنی نظر سے دیکھا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاہ حسین کے ہاں چرخہ کی علامت اتنی معنی خیز نہ ہوتی ،خواجہ فرید کو ہمہ اوست کا شاعر کہا گیا کہ انھوں نے اپنی شاعری میں مسجد، منبر، مصحف اور قرآن ، روہی اور چولستان، بارش اور باران، آس ، سرخی ، بیڑہ اور پان سب مظاہر میں اسی کو جلوہ گر پایا جس طور مولانا رومی نے خشک تار سے برآمد ہونے والی آواز کو' آوازِ دوست' کہا۔خواجہ فرید پر معترض لوگوں کا رویہ درحقیقت مظاہر کے اوجھل تعلق اور رشتے کو پہچان نہ سکنے کے سبب ہے ۔مظاہر کو کسی اور رنگ میں پیش کر کے اور ازلی وجود سے تعلق قائم کرتے ہوئے صوفیائے کرام نے 'حقیقتِ منتظر' کو' لباسِ مجاز' میں دیکھنے کی سعی کی۔

اس نظم میں علامہ اقبال کا کرب یہ ہے کہ وہ مولانا رومی سے شکوہ کناں ہیں کہ اس عہد کی آنکھ مظاہر اور اشیاء سے جڑے ہوئے ماورائے مظہر ازلی رشتوں کو دیکھنے سے محروم ہے۔اسی سبب سے اسے معلوم ہی نہیں کہ دوست کیا ہے اور دوست کی آواز کیا ہے۔ اس حوالے سے مولانا رومی کی زندگی میں زرکوب کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور

ہمارے خطے کا ایک قول معنویت سے ہم کنار ہوتا ہے کہ ہاتھ کام میں، دھیان یار میں۔ گھومتے ہوئے چرخے کی آواز، چکی کی گردش اور گڑگڑاہٹ بھلے بہ ظاہر اشیا کے زمرے میں ہی کیوں نہ آتی ہوں، شاہ حسین، بابا بلھے شاہ، خواجہ غلام فرید اور مولانا رومی تک آتے آتے محض بانسری، چرخہ اور چکی نہیں رہ جاتیں۔ دیکھنے والے کی نظر جب ان اشیاء کو ازلی حقیقت سے جب منسلک کرتی ہے کوشے کی ماہیت اور اس کا مظہر بدل جاتا ہے۔ اسی رمز کو غالب کو اس شعر میں پیش کیا:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا، دیدہ ء بینا نہ ہوا

علامہ اقبال اپنے عہد میں اس طرز کی نا بینائی کا شکوہ مولانا رومی سے کرتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں یہ عہد رقص و سرود میں غلطاں ہے لیکن ان مظاہر سے جڑے ہوئے بھیدوں سے ناواقف ہے۔ اقبال نے اس شکوے میں یورپ کی تخصیص کر دی کہ اس کا نغمہ رفعت پر لے جانے کی بجائے خاک کی طرف کھینچتا ہے۔ اس سرد زندگی کا اشارہ اقبال کے ہاں 'پیامِ مشرق' میں واضح ہے کہ جس کے اولین صفحہ پر انھوں نے گوئٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مغرب اب مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔ 'آوازِ دوست' سے ہی مشرق و مغرب کا فرق سامنے آتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مغرب تاب ناک ہے، روشن تر ہے اور با فروغ ہے لیکن وہ 'آوازِ دوست' کی رمز سے ناآشنا ہے۔ اس کرب ناک صورت حال پر مولانا رومی اقبال کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست
طعمہء ہر مرغکے انجیر نیست

مولانا رومی کے شعر کی رو سے ہر کسی کو سماعِ راست نصیب نہیں ہوتا، مرغ کے ہر بچے کے مقدر میں انجیر کا لقمہ نہیں ہوتا۔ اس امر کو تسلیم کرنا جبر و قدر میں سے جبر کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ روایت ہے کہ علی ہجویری داتا گنج بخش کو ان کے مرشد نے ایک دن ملول و مفہوم دیکھ کر کہا تھا کہ جب تم خیر اور شر کے پیدا کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تو ان کے سبب خود کو مغموم بھی مت کرو۔ ان اشعار کی روشنی میں ہمیں وہ اقبال نظر آتا ہے کہ روحانی تجربے کو خاصوں اور منتخب لوگوں کی شے سمجھتے ہیں۔ گویا یہ ایک عطا ہے، ریاضت اور مجاہدہ کا دخل اس میں زیادہ نہیں۔ علامہ اقبال کا مولانا رومی سے یہ استفسار مظاہر کے منقطع رشتے کے بارے میں ہے۔ ان کے خیال میں مظاہر کے نہاں خانوں سے ہمارا رشتہ کٹ جانے کے سبب دورِ حاضر بے ثبات و بے یقیں و بے حضور ہے۔ جواب میں مولانا رومی کے شعر سے علامہ اقبال جواب اور حوصلہ دونوں پاتے ہیں کہ ہر کسی کو سماعِ راست حاصل نہیں ہوتا اور ہر مرغ کے مقدر میں انجیر کا لقمہ نہیں ہوتا۔

مرید ہندی

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق وغرب — روح میں باقی ہے اب تک درد وکرب

پیر رومی

دستِ ہر نااہل بیمارت کند

سوئے مادر آ کہ تیمارت کند ۵

روح کا کرب ہماری شعری روایت کا ایسا موضوع ہے کہ اس میں زبان، عہد اور جغرافیہ کی حد نہیں لگائی جاسکتی۔ سوچنے والا ہر ذہن اور تخلیقی مزاج رکھنے والا ہر فن کار اسی کرب کا سامنا کرتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا علوم کی وسعت اس کرب کی گہرائی و گیرائی کو اپنی حدود میں لاسکتی ہے اور کیا علوم اس کرب کو ختم کر سکتے ہیں۔ حیاتِ اقبال سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے لوگ بھی ان کی وسعتِ علمی سے آگاہ ہوں گے، مولانا رومی کی علوم پر گرفت سے کون آشنا نہیں۔ پیر و مرید دونوں علوم کے غوطہ زن تھے۔ علامہ روح کے کرب کے سامنے علوم کی کم مائیگی پر شکوہ کناں ہیں کہ 'اب تک' یہ کرب باقی ہے۔ مولانا رومی کے شعر سے انھیں وہی جواب حاصل ہوتا ہے کہ جو ہمارے خطوں کی لوک دانش کی میراث ہے اور ادب کو اہم موضوع بھی، ہم سے صحبتِ ناجنس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اقبال ہی کے الفاظ میں کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور۔ اہلیت اور نااہلیت اہم معاملہ ہے جو زندگی کے معمولی مدارج سے لے کر اعلیٰ و ارفع درجوں تک اپنا اثر دکھاتا ہے۔ مولانا رومی روح کے کرب کا باعث نااہل ہاتھ کو قرار دیتے ہیں اور اس کا حل اپنی اصل کی طرف لوٹنے کو سمجھتے ہیں۔

جہاد کا تصور مسلم امت میں اہم تر موضوعات میں سے ایک ہے۔ اس تصور پر زمانے کی اتنی گرد پڑتی رہی کہ ہر عہد میں اس کی غایت اور تشکیلی عناصر پر بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہا۔ اس وقت دنیا میں قتل و غارت گری کا منظر ہے۔ عالمی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو بزورِ بازو نیست و نابود کرنے پر عمل پیرا ہیں۔ ان حالات میں خودکش بمبار کے حملوں اور دہشت گردی کے ماحول نے جہاد کے تصور کو اپنے ساتھ جوڑ رکھا ہے، یہ الگ بات کہ مختلف اسلامی ممالک کے علماء نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اسے جہادی تصور سے الگ کیا ہے لیکن شاید علماء کے فتوے بھی کام نہیں آ رہے۔ علامہ اقبال کے عہد میں ایسا منظر نہ تھا لیکن ان کے ہوتے ہوئے جہاد کے تصور پر گہرے سائے اڈے تھے کہ انھیں اس فرمانِ جدید کی نفی کرنی پڑی کہ جس کی رو سے جہاد کو مردِ مسلماں پر حرام قرار دینے کی سعی کی گئی۔ یہ بحث اب بھی جاری ہے کہ جہاد کا حکم دینا ریاست کا فرض ہے، انفرادی معاملہ نہیں۔ انفرادی کاوش کو جہاد کا نام نہیں دیا سکتا لیکن خارجی عوامل اس تصور کی کما حقہ تائید نہیں ہو پا رہی۔ ریاست کو نظر انداز کرکے جہادی قوتیں انفرادی سطح پر سرگرم دکھائی دیتی ہیں۔ علامہ اقبال جہاد کے تصور کے بارے میں مولانا رومی سے استفسار کرتے ہیں کہ جس سے اس مسئلے کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تصور ان کی فکری دنیا میں کس حد تک حل طلب تھا۔

مرید ہندی

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد کھول مجھ پر نکتہء حکمِ جہاد

پیر رومی

نقش حق را ہم بہ امرِ حق شکن

بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن ۶

اس شعر میں علامہ اقبال کا لب و لہجہ اس عقیدت سے بھرا ہوا ہے جو آپ مولانا رومی کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے اور جس کے غلبے کے سبب انھوں نے خود کو 'مرید ہندی' اور مولانا رومی کو 'پیررومی' کہا۔ اس شعر میں مولانا رومی کی نگاہ کو وہ اپنے دل کی کشاد کا سبب قرار دیتے ہوئے اپنے دل کی اس بے چینی کا حل طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو جہاد کے تصور کے باب میں ان کے دل میں تھی حال آں کہ یہ معاملہ عقل کا ہے۔ مولانا رومی سے ایک عقلی تصور کے باب میں جہانِ دل سے رہنمائی طلب کرنا ایک اشارہ ہے کہ جہاد کا تصور عقل کے ساتھ ساتھ دل سے وابستہ ہے۔ مولانا رومی کے جس شعر کو انھوں نے جواب کے طور پر منتخب کیا، اس شعر میں جہاد کا تصور ایک صوفی کا تصور ہے کہ جس کی رو سے جہاد جس کے خلاف کیا جا رہا ہے، وہ بھی 'نقش حق' ہے جس کو 'امر حق' سے ختم کیا جانا چاہیے۔ اس بارے میں مولانا کی تشبیہات نہایت عمدہ ہے کہ انھوں نے آئینہ اور سنگ کی مثال دی کہ دوست کے آئینے پر دوست کے پتھر کو دے مارو۔ صوفیاء کے ہاں خیر اور شر دونوں کو 'امر حق' کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بلندی کے اس درجے کے سبب 'شر' سے وابستہ تنفر اور ذاتی عناد جاتا رہتا ہے۔ علی ہجویری داتا گنج بخش نے بھی 'شر' کی تخلیق کو انسانی قدرت سے ماوراء قرار دیا کہ اس کی تخلیق کا سبب خود انسان نہیں اور نہ ہی وہ اس کے پیدا ہونے پر کوئی قدرت رکھتا ہے۔ مولانا رومی کے اس شعر میں 'شر' کو نقش حق اور امرِ حق سے تعبیر کیا گیا۔ ہمارے زمانے میں مخالف نظریات اور خیالات کے بارے میں جو شدت دکھائی دیتی ہے، اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہم نے اسے ذاتی معاملہ سمجھ کر اپنے تئیں عدالت لگانے، سزا دینے اور مار ڈالنے کا رویہ اپنا لیا ہے۔ اگر موجودہ زمانے میں فتنوں کو مولانا رومی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس شدت پسندی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کی اردو نظموں میں جہاد کے موضوع پر کئی نظمیں موجود ہیں کہ جن میں جہاد کے بارے میں ان کے معاصرانہ تصورات کی جھلک بھی موجود ہے۔ 'ضرب کلیم' میں اس موضوع پر ان کی دو نظمیں 'آزادیِ شمشیر کے اعلان پر' اور 'جہاد' قابلِ ذکر ہیں۔ 'آزادیِ شمشیر کے اعلان پر' اقبال اس تلوار کی تلاش میں ہیں کہ جو فقر سے حاصل ہوتی ہے۔

ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار آجائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدر کرار ؔ

علامہ اقبال کی اردو نظم 'جہاد' اس عہد کی نشانی ہے کہ جب جہاد بالقلم پر زور دیا گیا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ اب عالمی تناظر میں تلوار کارگر نہیں رہی۔ علامہ اقبال قدرے طنزیہ انداز میں فتوی دینے والے شیخ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا دستِ مسلماں میں تیغ و تفنگ باقی ہے۔ علامہ اقبال نے اس نظم میں جس مردِ مسلماں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کے پاس ایسا دل ہی نہیں کہ جو موت کی لذت سے آشنا ہو۔ ترک جہاد کی تعلیم تو اسے دی جانی چاہیے کہ جس کے پنجہء خونیں سے دنیا کو خطرات لاحق ہو۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے یورپی اقوام کے دوہرے معیار کو بھی نشانہ

بنایا ہے کہ وہ خود اپنے تصورات کی حفاظت کے لیے زرہ بند ہو گئے ہیں لیکن بے ذوق اور بےعمل مسلمان کو ترک جہاد پر اکساتے ہیں۔ ان کے خیال میں شر جہاں اور جس خطے میں ہو، اسے شر ہی کہنا چاہیے اور اس بارے میں قوم ،ملت اور جغرافیہ کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔علامہ اقبال اس صورت کو تسلیم کرنے پر رضامند دکھائی نہیں دیتے کہ شر اور فساد کے نام پر اسلام کا محاسبہ کیا جائے اور یورپ سے درگزر کیا جائے۔

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر [۸]

ان اردو نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'جہاد' کی غایت اور مقصد علامہ اقبال کی فکری دنیا کا اہم موضوع ہے۔ اس اہم تر موضوع پر بھی وہ مولانا رومی سے مدد کے طلب گار محسوس ہوتے ہیں ۔ ان کی نظم کے آخری اشعار کو موجودہ عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقوامِ عالم میں فلسطین، شام ،عراق، افغانستان، لیبیا وغیرہ کی صورت حال اور عالمی طاقتوں کا مسلمان ممالک کے خلاف پابندیوں کے مظاہروں سے منظر واضح ہوجاتا ہے۔

مولانا رومی سے علامہ اقبال کے استفسارات کا ایک بڑا حصہ تہذیبِ مغرب کی چمک دمک کے سامنے مسلمان نوجوان کی ذہنی اور روحانی پسپائی ہے۔

مریدِ ہندی

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب

پیر رومی

ظاہر نُقرہ گر اسپید است و نو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو!

مریدِ ہندی

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں! ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں!

پیر رومی

مرغِ پر نا رُستہ چوں پراں شود
طعمۂ ہر گُربۂ دراں شود [۹]

یہ بھی کیسا عجیب اتفاق ہے کہ مولانا رومی کو اپنے زمانے میں اس نوع کے سوالات کا سامنا کم از کم مغرب سے نہ تھا۔ تہذیبِ مغرب علامہ اقبال کی شاعری اور فکر اور بہت بنیادی موضوع ہے اور اسی بنا پر انھوں نے گوئٹے کے نام

''پیامِ مشرق'' بھیجا۔ تہذیب مغرب کے سرد سینے اور چاندی کی مانند چمک دمک سے جڑا ہوا تصور ان کے مولانا ہاں رومی کی وساطت سے پہنچا۔ افرنگ کے سحر میں مبتلا نوجوانوں کے لیے مولانا رومی کے الفاظ میں علامہ اقبا ل اس پرندے کی مثال دیتے ہیں کہ جس کے ابھی پر نہ نکلے ہوں، اگر وہ اڑان بھرنے کی کوشش کرے گا تو بلی کا نوالہ بن جائے گا۔

شارحینِ اقبال کے ہاں اقبال کے تصورِ وطن کی تفہیم وتعبیر میں ایک الجھن اس سبب سے بھی پیدا ہوئی کہ علامہ اقبال محض ایک شاعر نہ تھے بل کہ عملی طور پر سیاست دان بھی تھے، فلسفہ اور فکری مباحث اس کے سوا ہیں ۔ جب ایسی صورتِ حال ہو کہ کسی ایک شخصیت کے اندر متنوع جہات در آئیں تو انھیں الگ الگ کر کے دیکھنا تعبیر کو درست سمت میں نہیں لے جاتا ۔ علامہ اقبال کی شعری اور فکری دنیا میں وطن کا تصور جغرافیہ سے نہیں ہے جبکہ وہ سیاست دان کے طور پر مسلم لیگ کے جلسہء الہ آباد میں وطن کا جو تصور دے چکے، اس میں جغرافیہ بہت واضح ہے اور پاکستان کی فکری بنیاد میں ان کے خطبہ الہ آباد کی بہت اہمیت ہے۔ یہ اقبالیات کا نیا موضوع نہیں، تلاش کرنے والوں کو اس موضوع پر بہت کچھ اچھا برا لکھا ہوا مل جائے گا۔ اس نظم کی رو سے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وطن کا تصور خود علامہ اقبال کی ذات میں استفسار کی شکل میں موجود رہا اور یہ حل طلب معاملات میں سے ایک تھا۔ اسی لیے مولانا رومی سے استفسار کرتے ہیں کہ دین اور وطن میں آویزش کس حد تک ہوسکتی ہے اور کیا جاں کے جوہر پر بدن کو فوقیت دی جاسکتی ہے۔

مرید ہندی

تا کجا آویزشِ دین و وطن　　جوہر جاں پر مقدم ہے بدن

پیر رومی

قلب　پہلو　زند　بازر　بشب

انتظار　روز　می　داردذہب　۱۰

نظم کے اگلے اشعار میں علامہ اقبال سرِ آدم سے آگاہ کرنے کے لیے مولانا رومی سے رجوع کرتے ہیں کہ آگاہی کے سبب خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کی سی تابندگی عطا کی جائے۔ علامہ اقبال کے ہاں خودی کا فلسفہ سرِ آدم کی جستجو پر مبنی ہے۔ ان کے اردو کلام کی بیشتر نظمیں اسی تلاش کی روداد ہیں جن میں '' فرشتے جنت سے آدم کو رخصت کرتے ہیں''، '' روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔

مریدِ ہندی

سرِ آدم سے مجھے آگاہ کر　　خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر

پیر رومی

ظاہرش　را　پشہ　ء　آرو　بچرخ

باطنش　آمد　محیط　ِ　ہفت　چرخ　۱۱

مولانا رومی سے علامہ اقبال کو سرِ آدم کا سراغ درج ذیل شعر کی صورت میں ملتا ہے اور اس کی تعبیر ان کی مثنوی ''جاوید نامہ'' میں دکھائی دیتی ہے کہ جس میں انھوں نے مولانا رومی کی معیت میں ہفت افلاک کی سیر کی۔ مولانا رومی کے خیال میں آدم کا ظاہر ایسا ہے کہ ایک مچھر اسے چکروں میں ڈال جاتا ہے جبکہ اس کا باطن ایسا توانا ہے کہ سات آسمان سے اندر سما جاتے ہیں۔

اس نظم میں مولانا رومی سے علامہ اقبال کا اگلا استفسار بھی سرِ آدم سے وابستہ ہے کہ غایت آدم کیا ہے، خبر یا نظر۔ اس استفسار میں بھی علامہ اقبال نے مولانا رومی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی دانائی کے نور کا تذکرہ کیا کہ جس سے خاک بھی روشن تر ہو جاتی ہے۔ مولانا رومی کے بقول آدمی تو دید ہے، باقی تو سب پوست ہوتا ہے۔ علامہ اقبال یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ امت کس آزار سے ہلاک ہوتی ہیں اوراس کے فوراً بعد وہ مسلم امت کی بات کرتے ہیں کہ اب مسلمانوں میں وہ رنگ و بو باقی نہیں رہا، آخر کیا وجہ ہے کہ اس کا لہو سرد ہو گیا ہے۔

مریدِ ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو

پیر رومی

تا دلِ صاحبدلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رُسوا نہ کرد ۱۲

مسلمانوں کے زوال کی کہانی اردو شاعری میں علامہ اقبال سے بہت پہلے بیان ہوتی چلی آ رہی تھی کہ جسے حقیقت نگاری کا قرینہ علامہ اقبال کے پیش رو، مولانا حالی، نے عطا کیا۔ علامہ اقبال کی اردو شاعری کو سرسری نگاہ سے پڑھنے والے بھی اس امر سے آگاہ ہیں کہ ان کے ہاں سوز کی ایک بنیادی وجہ مسلم امت کا زوال تھا۔ کبھی انھوں نے اس امت کو 'راکھ کا ایک ڈھیر' قرار دیا تو کہیں اسے خاکستر کہہ کر اس میں سے فاطمہ بنت عبداللہ کو حیرت کے ساتھ دیکھا کہ ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی۔ مولانا رومی سے ان کا استفسار بہ ظاہر تو مجموعی طور پر ہے لیکن علامہ اقبال کے فکری نظام کو سامنے رکھا جائے تو گمان ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ مسلم امت کی طرف زیادہ ہے۔ مولانا رومی کا جواب بہ ظاہر بہت سادہ ہے کہ جب کسی صاحبِ دل کا دل دکھایا جاتا ہے تو خدا اسقوم کو رسوا کر دیتا ہے۔ اس استفسار کا جواب اتنا سادہ نہیں، اسی سادگی میں پختہ کاری کی انتہا ہے۔ اگلے ہی اشعار میں علامہ اقبال بازارِ وجود کے بے رونق ہونے کا شکوہ کرتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں کہ مردوں کا فائدہ کس سودے میں ہے کہ جس سے اس بازارِ وجود میں رونق ہو۔ مولانا رومی کی نظر سے انھیں جواب ملتا ہے کہ زیرکی فروش کر کے حیرانی خریدو کیونکہ زیرکی محض ایک ظن ہے جبکہ حیرانی اصل میں نظر ہے۔ اس نظم میں بھی علامہ اقبال اپنے عہد اور معاصرین کے ہاں قربت شاہی کی آرزو کا شکوہ کرتے ہیں اور خود کو اس باب میں تنہا کھڑا پاتے ہیں۔ مولانا رومی سے انھیں یہی جواب ملتا ہے کہ بادشاہ کے سر کی مانگ پر چلنے سے کہیں بہتر ہے کہ کسی روشن دل انسان کے غلام بن جاؤ۔

ہر بڑے تخلیقی ذہن کی مانند مولانا رومی اور علامہ اقبال کا پسندیدہ موضوع 'جبر وقدر' ہے۔ علامہ اقبال کی اردو شاعری کا غالب مزاج ' راکب تقدیر جہاں' کا ہے۔ ان کی اردو شاعری میں انسان تگ ودو، مسلسل عمل، تحرک، طلب، جستجو سے عبارت ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظر فردا قوم سے شاکی دکھائی دیے۔ ان کی اردو شاعری میں جو بنیادی تصورات ابھرے، ان میں تقدیر پرستی کی گنجائش کم ہے۔ اسی لیے وہ حرکت وعمل کو زندگی میں جاری وساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی کئی اہم نظمیں موجود ہیں لیکن فی الوقت ' روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' میں وہ آدم کی رضا کو تقدیر کا راکب قرار دیتے ہیں۔ مولانا رومی سے ان کا ایک استفسار 'جبر وقدر' سے متعلق ہے۔

مرید ہندی

اے شریک ِ مستی ِ خاصان بدر
میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر!

پیر رومی

بال بازاں را سوے سلطان برو
بال زاغاں را بگورستاں برو [۱۳]

ان اشعار میں مولانا رومی سے علامہ اقبال کی غیر معمولی عقیدت اس طور سامنے آتی ہے کہ انھوں نے مولانا رومی کو' شریک مستی خاصانِ بدر' کہا۔ یہ بہت بڑا اخراج عقیدت ہے جو مولانا رومی کو پیش کیا گیا۔ میری کم علمی ہے کہ مجھے اس زیادہ گہرا اخراجِ عقیدت اردو شاعری میں کہیں اور کسی ہستی کے لیے دکھائی نہیں دیا۔ اپنے اس اہم استفسار کے جواب میں علامہ اقبال نے مولانا رومی کا جو شعر بہ طورِ جواب منتخب کیا، اس شعر کی فضاء علامہ اقبال کے مجموعی تخلیقی اور فکری رویے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مولانا رومی پرندوں میں سے'' باز'' اور'' زاغ'' کی پروں کی ساخت کو جبر و قدر سے وابستہ کرتے ہیں کہ ان کی پروں کی ساخت ہی انھیں سلطانی عطا کرتی ہے یا پھر گورستاں لے جاتی ہے۔

مولانا رومی سے علامہ اقبال غایت دینِ نبی ﷺ پوچھتے ہیں تو انھیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے دین میں مصلحت جنگ وشکوہ سے ہے جبکہ دینِ عیسی میں وہ غار وکوہ سے ہے۔ سینے میں دل کی بیداری کیسے ہو اور اس آب و گل کو کس طرح قابو میں لایا جائے، اس سوال پر انھیں مولانا رومی کے اشعار سے جواب ملتا ہے کہ آدمی کو زمین پر ایسے رہنا چاہیے کہ جیسے کوئی گھوڑا اس پر دوڑتا ہے نہ کہ اس طرح جیسے کوئی جنازہ کسی کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ قیامت کا یقین کیسے آئے تو مولانا رومی جواب میں کہتے ہیں کہ خود قیامت بن جاؤ۔ اس نظم میں علامہ اقبال اپنے معروف تر نظریہ خودی کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے مولانا رومی سے عرض کرتے ہیں کہ خودی اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ ہو چکی ہے۔ مولانا رومی کا جو شعر علامہ اقبال نے اس استفسار کے جواب میں درج کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ شکار کے لائق تو صرف عشق ہی ہے لیکن وہ کب کسی کے دام میں آتا ہے۔ علامہ اقبال ایک اور انداز سے ملت کے وابستہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ملت کی حیات آخر کس طرح محکم ہو سکتی ہے تو مولانا رومی کے ہاں سے علامہ اقبال کو یہ جواب ملتا ہے کہ ایسا دانہ مت بنو کہ جسے کوئی پرندہ آسانی سے چگ لے اور نہ ہی ایسے غنچہ بنو کہ جسے وادی

و دامن سے بہ آسانی توڑ لیا جائے،زیادہ بہتر ہے کہ ایسا دانہ بنو جو تہِ دام ہواور ایسا غنچہ بنو کہ جو گیاہ میں پنہاں ہو۔دل کی تلاش کے موضوع پر علامہ اقبال اس جستجو کا اظہار مولانا رومی کے سامنے بھی کرتے ہیں تو مولانا رومی انھیں جواب دیتے ہیں کہ تمھارے پاس دل تو ہے اور اس میں بلندی وپستی بھی موجود ہے لیکن تو نے اپنے دل کو دل سمجھا اور اہلِ دل کی تلاش کو ترک کر بیٹھا۔ دل کی تلاش سے کہیں بہتر ہے کہ اہلِ دل کی تلاش کی جائے۔اسی نظم میں علامہ اقبال نے ایک بار پھر اپنی ناقدری کا شکوہ کیا ہے کہ بہ ظاہر میرا فکر آسمانوں کی بلندی پر ہے لیکن میں زمیں پر خوار و زار و دردمند ہوں ،کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں اور اس راہ میں ٹھوکریں کھاتا ہوں ،آخرایسا کیوں ہے کہ کارزمیں میرے بس سے باہر ہے۔مولانا رومی سے یہ حوصلہ پرور جواب ملتا ہے کہ جو آسمانوں پر اپنی رفتار قائم رکھتا ہے،اسے زمین پر چلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔علامہ اقبال کوعلم وحکمت کا سراغ اور سوز و درد و داغ کی جستجو ہے کہ جس کے لیے وہ مولانا رومی سے استفسار کرتے ہیں ۔مولانا رومی کا جواب اہم تر ہے:

مریدِ ہندی

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ   کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

پیر رومی

علم وحکمت زاید از نانِ حلال
عشق ورقت آید از نانِ حلال [۱۴]

شاعری اورتخلیق کوعموماً خلوت سے منسوب کیا جاتا رہا ہے اورشعراء کی سوانح میں مردم بیزاری کے عناصر کی ترویج نے اس رائے کومزید تقویت بخشی ہے۔علامہ اقبال اس بارے میں بھی علامہ اقبال سے استفسار کرتے ہیں کہ زمانے کا تقاضا انجمن ہے جبکہ سوزِ سخن بے خلوت نہیں ۔مولانا رومی ایک مثال کی مدد سے جواب دیتے ہیں کہ خلوت دوست سے نہیں ، اغیار سے ہے۔یہ قیمتی لباس جاڑے کے لیے ہے ، بہار کے لیے نہیں۔اس نظم میں علامہ اقبال کا آخری شعر سرزمین ہند سے متعلق ہے کہ اب ہند میں نہ نور باقی ہے اور نہ ہی سوز ، اس دیس میں اہلِ دل تیرہ و تار ہیں ۔مولانا رومی کا درج ذیل شعر علامہ اقبال نے اپنے اس استفسار کے جواب کے طور پر درج کیا:

پیر رومی

کارِمرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است [۱۵]

فارسی شاعری میں ہی نہیں علامہ اقبال نے اردو شاعری میں مولانا رومی کو اپنا مرشد، رہنما اور قافلہء عشق کا سالار قرار دیا۔ فی زمانہ بدقسمتی سے نئی نسل فارسی سے نابلد ہے لیکن اردو شاعری کی وساطت سے وہ مولانارومی کے افکار سے آگاہ ہے کہ علامہ اقبال نے انہیں اپنا پیر اور مرشد قرار دیتے ہوئے کہا

تو بھی ہے اسی قافلہ ء شوق میں اقبال
جس قافلہء شوق کا سالار ہے رومی

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

حوالہ جات:

۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو (لاہور: اقبال اکادمی، طبع یاز دہم، ۲۰۱۳ء) ص۴۶۲۔
۲۔ ایضاً ، ص۲۷۵۔
۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں "پیر و مرید بہ خطِ اقبال" مشمولہ تحقیق نامہ، شمارہ ۲۱ (جولائی تا دسمبر ۱۷ء) شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ص۱۷۴۔
۴۔ ایضاً ، ص۴۶۳۔
۵۔ ایضاً ، ص۴۶۳۔
۶۔ ایضاً ، ص۴۶۳،۴۶۴۔
۷۔ ایضاً ، ص۵۳۹۔
۸۔ ایضاً ، ص۵۴۰،۵۴۱۔
۹۔ ایضاً ، ص۴۶۴،۴۶۵۔
۱۰۔ ایضاً ، ص۴۶۵۔
۱۱۔ ایضاً ، ص۴۶۵۔
۱۲۔ ایضاً ، ص۴۶۶۔
۱۳۔ ایضاً ، ص۴۶۷،۴۶۸۔
۱۴۔ ایضاً ، ص۴۷۱۔
۱۵۔ ایضاً ، ص۴۷۲۔